یادوں کے

دریچے

مصنفہ

شاہدہ ہارون

یادوں کے دریچے

بینا، ماہا کے ساتھ امریکہ سے دو مہینوں کے لئے پاکستان آئی، مجھ سے بھی ملنے آئی۔ اپنی مخصوص عادت کے مطابق، ملک کے حالات کی، خاندان کی اور اِدھر اُدھر کی گپ شپ لگاتی رہیں۔ اپنے بابا (سرور بھائی) اور اپنے بڑے ببّا (اختر بھائی) جن کو اُس نے دیکھا بھی نہیں، بہت سی باتیں کرتی ہیں اس کا اصرار تھا کہ بڑے ببا کے متعلق کچھ لکھوں اور کچھ اور بتاؤں۔ ان باتوں کے دوران مجھے بھائی بہت یاد آئے۔ سوچا کہ اِن یادوں کو کاغذ پر اُتار دوں۔ بینا خوش ہو جائے گی، آصف نے بھی بڑی حوصلہ افزائی کی۔ اور یوں یہ باتیں۔ یہ یادیں گزری ہوئی اذیتیں صدیوں سے آباد برصغیر کا بانٹا جانا اور اس تقسیم کے دوران انسانی خون اتنا سستا ہو گیا کہ ملک کی زمین لہولہو ہو گئی۔ ملک تو تقسیم ہو گیا لیکن کس کو کیا ملا، کس پر کیا گزری وہی بتا سکتا ہے جس پر سب کچھ گزر گیا۔

لو بینا! اپنے بڑے ببا کی اور خاندان کی باتیں سنو، جو کچھ میرے ذہن میں ہے وہ میں تمہیں بتا دیتی ہوں۔ ہم لوگ الہ آباد کے دو بڑے زمینداروں کی اولادیں تھیں۔ میرے نانا میاں عبدالقادر مقدری گاؤں کے بڑے زمیندار تھے اور میرے دادا میاں عبدالغفور ہروارہ (گاؤں) کے بڑے زمین دار تھے۔ دونوں طرف مختلف اقسام کے بہترین آموں کی فصل ہوا کرتی تھی۔ اس کے علاوہ اناج، سبزیاں اور دوسرے پھل بھی ہوتے تھے۔ میں نے اپنے گھر میں کبھی سبزی پھل یا اناج بازار سے منگواتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ہم پانچ بہنیں اور دو بھائی تھے۔ اماں کہتی تھیں کہ درمیان میں دو تین اور بچے تھے جو بچپن میں ہی انتقال کر گئے۔ سب سے بڑی آپا جان تھیں جن کو میں نے اپنے گھر میں کبھی نہیں دیکھا۔ میری پیدائش سے پہلے ان کی شادی ہو گئی تھی۔ ویسے بھی وہ نانی کے گھر پلی بڑھی تھیں۔ اس لئے بہنوں کے درمیان جو تعلق، ہنسی مذاق، چھیڑ چھاڑ ہوتی ہے وہ ان سے کبھی نہیں ہوئی۔ ہم سب ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ ان کے شوہر بڑے بہنوئی ڈاکٹر سرجن تھے بہت نیک اور اعلیٰ ظرف الشان تھے۔

میرے دادا زمین داری کے علاوہ چمڑے کا بزنس بھی کرتے تھے۔ اسی وجہ سے ان کے تینوں بیٹے میرے بڑے ابا، منجھلے ابا اور میرے ابا سب کی رہائش کانپور میں تھی۔ میں اپنے بہت ہی بچپن میں جاؤں تو کانپور کا بڑا سا گھر میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ جس کی مالکن میری اماں تھیں۔ بہت سارے نوکر وغیرہ تھے۔ دونوں بھائی اسکول جاتے تھے، کانپور میں ہم بہنوں نے ابھی اسکول جانا شاید شروع

نہیں کیا تھا کیونکہ وہاں کا اسکول میرے ذہن میں نہیں ہے۔ اکثر ریل گاڑی میں بیٹھ کر الہ آباد جانا یاد ہے۔ میرے دونوں بھائی ڈیل ڈول کے اچھے، خوبصورت تھے۔ میرے ماموں اور اماں دو ہی بہن بھائی تھے۔ اور دونوں خاندان بھائیوں پر جان چھڑکتے تھے۔ دونوں خاندانوں کی آنکھ کا تارا تھے۔ گھر کے سارے مرد کانگریس سے تعلق رکھتے تھے۔ میرے نانا جوانی ہی میں انتقال کر گئے زمینداری کا سارا کام نانی سنبھالتی تھیں۔ گھر میں بحث مباحثہ پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا۔ ماموں الہ آباد میونسپل کارپوریشن کے میئر تھے۔ یوں گھر میں اور بھی رونق رہتی تھی۔ الہ آباد کے بہت بڑے مشینری اسکول میں ہم نے (میری وانا میکر) جانا شروع کر دیا تھا۔ ماموں کی دو بیٹیاں اور ہم دو بہنوں نے پہلے جانا شروع کیا اور پھر باری باری جاتے رہے۔ گھر میں ڈھیروں اخبار اور رسالے آتے تھے۔ چھوٹی عمر سے ہی کتابیں اور اخبار پڑھنے کا شوق ہم سب کو تھا۔ اختر بھائی بہت پڑھتے تھے اور ہم بہنوں پر بھی نگاہ رکھتے تھے کہ ہم کیا پڑھ رہے ہیں۔ گھر میں ایک لائبریری بھی بنائی تھی۔ جس سے محلے کے لڑکے فائدہ اٹھاتے تھے۔

اختر بھائی بظاہر بہت اچھی صحت کے مالک تھے۔ لیکن کبھی کبھی ان کو ایسا بخار چڑھتا کہ اترنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ سب پریشان ہو جاتے تھے۔ کبھی کبھی پھوڑے پھنسی ایسی نکلتی تھیں جو بہت تکلیف دہ ہوتی تھیں۔ نانی اور ماموں کو جب ان حالات کا علم ہوتا تو وہ بے چین ہو جاتے اور اماں کو حکم ملتا کہ الہ آباد آ جاؤ۔ شاید بھائی کو کانپور کی آب و ہوا موافق نہیں آتی تھی اماں بے چاری بیٹے کی تکلیف دیکھ کر نانی اور ماموں کے حکم کی تعمیل کرتی سامان باندھ کر اور ہم سب کو ساتھ لے کر روانہ ہو جاتیں، کئی مرتبہ اسی طرح ہوا پھر ہم ہمیشہ کے لئے الہ آباد چلے گئے۔ وہاں ایک بڑے گھر میں ماموں ان کی فیملی اور نانی سب آباد تھے۔ ایک گلی چھوڑ کر الہ آباد کی مین روڈ پر غالباً تین کمروں کا ایک چھوٹا گھر، برآمدہ، صحن وغیرہ تھا جو نانا کا تھا جس کے لئے یہ کہا جاتا تھا کہ یہ گھر نانا نے اماں کو دیا ہے، بہر حال ہم اس گھر میں آباد ہو گئے۔ ہم سب کا داخلہ اسکولوں میں ہو گیا۔ ابا کانپور سے آتے جاتے رہتے تھے۔ بچپن کا دور تھا۔ زندگی ٹھیک ٹھاک گزر رہی تھی۔ ہمارے پڑوس میں ہندو خاندان آباد تھے۔ درمیانہ درجہ کے لوگ تھے۔ تہواروں پر کھانے اور مٹھائیاں بھیجی جاتی تھیں۔ ہمارے گھر میں ایک ہندو نوکر تھا جس کا نام ستیا تھا۔ اندر باہر کے سارے کام کرتا تھا۔ بھائی کی بیماری کی وجہ سے ہندو ڈاکٹروں کا آنا جانا بھی رہتا تھا۔ ڈاکٹر بینی بہادر، ڈاکٹر رام لکر تو مجھے اب تک یاد ہیں۔ میرے ابا کو تاش اور شطرنج کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ ڈاکٹر جب شام کو اپنے کاموں سے فارغ ہوتے تو ابا ان کی طرف چلے جاتے اور رات دیر تک محفل جماتے رکھتے

اور جب گھر آتے تو اماں کی ڈانٹ بھی کھاتے۔

اسی دوران میرے کان میں ہندو مسلم فسادات، کبھی شیعہ سنی فسادات کی خبریں پڑھتی رہتی تھی کبھی جواہر لال نہرو کی تقریریں پڑھتی رہتی تھیں۔ اخبارات اور رسالے پڑھتی تھی اس طرح معلومات میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اسکول میں میری ہندو دوست تھی رما ہنگل ’’آج بھی اس کا نام مجھے یاد ہے۔ ہماری دوستی اتنی مضبوط اور پر خلوص تھی کہ اسکول میں ہمارا نام ہندو مسلم دوستی کے سمپل کے طور پر لیا جاتا تھا۔ کبھی کبھی ہم دونوں اسکول میں بیٹھ کر، ملک میں ہونے والی گڑ بڑ پر غور کرنے کی کوشش کرتے لیکن کچھ زیادہ سمجھ میں نہ آتا۔

ہماری آپا جان گرمیوں کی چھٹیوں میں اپنے بچوں، لاڈلے بھائیوں اور ساجدہ آپا (مجھ سے بڑی بہن تھیں) کو ساتھ لے کر کسی پہاڑی مقام پر گھومنے کے لئے چلی جاتیں۔ کبھی شملہ، کبھی نینی تال اور کبھی سوری جاتیں۔ جب واپس آتیں تو میں آپا سے چھیڑ چھاڑ کرتی، کہاں کہاں گھومیں وغیرہ وغیرہ لیکن آپا بہت سنجیدہ مزاج تھیں۔ چپ چاپ گھر کے کاموں میں لگ جاتیں۔ ایک دفعہ آپا نے بتایا کہ دہرہ دون میں ماموں اور ابا وغیرہ کے دوست شفیع قدوائی کی فیملی سے بھی ملی، ان کی ایک صاحب زادی بھی ہیں جن کا نام کشور ہے۔ بہت پڑھی لکھی اور سمجھدار ہیں۔ بڑے بھائی اور ان کی کافی دوستی ہوگئی ہے۔ دونوں خوب گپ شپ کرتے اور خوش نظر آتے تھے۔ دل میں خیال آیا کہ کاش میں بھی ان کو دیکھوں۔ کچھ دنوں کے بعد بات ذہن سے نکل بھی گئی۔ ملک میں جلسے جلوسوں کا زور تھا۔ بڑے بھائی الہ آباد یونیورسٹی میں یونین کے جنرل سیکریٹری بن گئے تھے۔ ماسٹرز کا آخری سال تھا۔ جو پورا ہو گیا International Relalion ان کا Subjet تھا۔ یونیورسٹی میں ہونے والی مباحثوں کے بھی ماسٹر تھے۔ یونیورسٹی میں ان کا بڑا چرچا رہتا تھا۔ ہندوستان اور پاکستان کی علیحدگی کے سخت مخالف تھے۔ ہندوستان میں ہی کسی اچھی ملازمت کے خواہاں تھے۔ اس دوران ہندوستان میں افراتفری کا عالم اور بڑھ گیا۔ اس افراتفری میں کوئی پاکستان جانے کے حق میں تھا اور کوئی ہندوستان رہنے کو ترجیح دے رہا تھا۔ میرے چچازاد بھائی جن کو ہم سب فجو بھائی کہتے تھے، انہوں نے بھی الہ آباد یونیورسٹی سے گریجویٹس کیا۔ ان کا نکاح ساجدہ آپا سے ہو گیا۔ نکاح کیا ہوتا ہے کیسے ہوتا ہے یہ سب مجھے اس وقت بالکل سمجھ میں نہیں آیا، انتہائی سادگی اور خاموشی سے کیا گیا، میرا تو خیال ہے کہ آپا کو بھی کچھ سمجھ میں نہیں آیا ہوگا۔ صرف شرمانا آ گیا تھا۔ اسی دوران فجو بھائی ایک سال کے

اندر اندر شاید 1949ء تھا اپنی دلہن کو لے کر پاکستان آ گئے۔ ان کے ساتھ بڑے ابا اور ان کی واحد بیٹی بھی پاکستان آ گئے۔ اس طرح خاندان جو صدیوں سے ایک ہی گاؤں، ایک ہی شہر، ایک ہی محلے میں آباد تھے تقسیم ہونا شروع ہو گئے۔ کچھ ہی دنوں کے بعد آپا جان نے بھی پاکستان جانے کا نعرہ بلند کر دیا۔ اُن کے شوہر جو مشہور ڈاکٹر تھے پہلے ہی پاکستان آ کر اپنا کلینک اور اپنا گھر دونوں جما چکے تھے۔ پھر آپا جان کا ہندوستان میں رہنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ سرور بھائی کو ڈاؤ میڈیکل کالج میں داخلہ مل گیا وہ بھی پاکستان چلے گئے۔ آپا جان کا شدید اصرار تھا کہ بڑے بھائی ان کے ساتھ پاکستان چلے جائیں۔ ماموں بے چارے خاموش تھے اور اختر بھائی ان کے دل کی دھڑکن تھے لیکن حالات اتنے خراب تھے کہ کوئی کسی کو رائے نہیں دے سکتا تھا۔ آپا جان کا کہنا تھا کہ پانچ بچوں کو لے کر اکیلے سفر کرنا بہت مشکل تھا۔ ادھر پاکستان سے بھائی جان کا بہت اصرار تھا کہ اختر ان کے بیوی بچوں کو پاکستان پہنچا دیں پھر بے شک چلے جائیں۔ اس زمانے میں پاسپورٹ وغیرہ نہیں ہوتا تھا۔ آپا جان کے پاس ایک ڈرائیور کا پرمٹ فالتو تھا۔ اختر بھائی بمشکل اس بات پر راضی ہوئے کہ وہ آپا جان کو اس ڈرائیور کے پرمٹ پر پاکستان پہنچا کر واپس بھارت آ جائیں گے۔ وہ ہندوستان چھوڑتے وقت بہت پریشان، اداس اور مضطرب تھے۔ ان کو اپنے اسکول، کالج، یونیورسٹی کا سحر انگریز زمانہ یاد آ رہا ہو گا۔ اپنی ایک ایسی دوست کو چھوڑنے کا دکھ ہو گا وہ مثالی خاتون تھی اور ذہنی ہم آہنگی کی مثال تھیں۔ بھائی کو اماں، ابا اور ہم تین چھوٹی بہنوں کو یوں بے آسرا چھوڑنے کا بھی دکھ تھا۔ میرا چھوٹا سا ذہن اس تقسیم کو کسی طرح بھی قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ آپا جان کا بہت اصرار تھا کہ میں بھی ان کے ساتھ چلی جاؤں۔ لیکن میں نے انتہائی ہٹ دھرمی سے صاف انکار کر دیا۔ کہا کہ میں اماں کے وغیرہ کے ساتھ جاؤں گی۔

آج جب بھائی کو دنیا سے رخصت ہوئے 55 سال ہو گئے ہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کل کی بات ہو۔ کاش اس وقت میں بھائی کو آپا جان کے ساتھ جانے سے روک سکتی۔ ان کی دوست ان کی ہم سفر بن جائیں۔ دو جوان، خوبصورت اور پرخلوص دل ایک ہو جائے۔ لیکن یہ سب کچھ نہ ہو سکا۔ سب کچھ سیاست کی نظر ہو گیا۔ ہندوستان اور پاکستان کی روایتی دشمنی نے دونوں کو ملنے کی اجازت نہ دی۔ بھائی اس اس دوران مشہور صحافی بن گئے تھے۔ ان کو ویزا نہ مل سکا۔ اور تیس سال کی جوان عمر میں دنیا چھوڑ گئے۔ اور کشور سالوں اپنے اختر کا انتظار کرتے کرتے تھک کر عالم بالا پر جا کر ان سے مل گئیں۔ اس خوبصورت سے ملن کو میں نے اپنی آنکھوں

میں محفوظ تو کر لیا لیکن بڑے دکھی دل کے ساتھ۔

بھائیوں کے پاکستان آنے کے بعد، اماں ابا اور ہم تینوں بہنیں بمشکل ایک سال ہندوستان میں رہ سکے۔ گھر میں دلوں میں اور دماغ میں اداسی چھائی ہوئی تھی۔ بڑے بھائی بے چارے ابا کو بہت سمجھا رہے تھے کہ آپ یہاں آ کر بہت پریشان اور بے عزت ہوں گے۔ تکلفیں اٹھانی پڑے گی لیکن اولاد کی دوری مجبوری بن گئی۔ اس وقت ہر شخص اس طرح پاکستان کی طرف بھاگ رہا تھا۔ جیسے رہنے کے لئے محل تیار ہیں اور کھانے کے لئے من وسلویٰ اُتر رہا ہے۔ بہرحال 1950ء میں ہم لوگ بھی پاکستان کی سرزمین پر آ گئے اللہ کا شکر ہے کہ ہمیں کیمپوں میں نہیں رہنا پڑا، آپا جان کا بنگلہ کافی بڑا تھا۔ ہم سب کو وہاں سر چھپانے کا ٹھکانہ مل گیا۔ بڑے بھائی کو ہمارے آنے سے پہلے ہی Dawn اخبار میں ملازمت مل گئی تھی۔ وہ بڑی محنت سے اپنا کام کر رہے تھے اور صحافت کی دنیا میں قدم جما رہے تھے۔ بظاہر خوش اور پر جوش تھے۔ اپنی پوری تنخواہ آپا جان کے ہاتھ میں رکھ دیتے تھے۔ سرور بھائی Dow کے ہوسٹل میں رہ رہے تھے۔

ساجدہ آپا اور فجو بھائی نے بھی ہماری بہت مدد کی۔ راشدہ اور سعیدہ کو اپنے چھوٹے سے گھر میں رکھا اور اسکول میں داخل کروا دیا۔ میں اور ابا اماں آپا جان کے گھر میں رہے۔ میں نے پرائیوٹ طور پر میٹرک کا امتحان دینے کی تیاری شروع کر دی۔ ایک سال کے بعد بھائی نے پی آئی بی کالونی میں ایک تین کمروں کا نیا بنا ہوا گھر کرایہ پر لے لیا۔ آگے پیچھے برآمدہ اور ایک چھوٹا سا صحن تھا۔ ہم سب اس گھر میں آ کر بہت خوش تھے یہ ہماری چھوٹی سی جنت تھی۔ میں میٹرک کا امتحان دے کر پاس ہو چکی تھی۔ کالج میں داخلہ لینے کی شدید آرزو تھی۔ بھائی بھی یہی چاہتے تھے۔ بھائی ہمارے پاس رہتے کبھی آپا جان کے پاس چلے جاتے، میں نے شام کو ایک ٹیوشن سینٹر میں پڑھانا شروع کر دیا۔ ہمارے گھر کے قریب ہی جمال نقوی صاحب رہتے تھے ایک دن شام کو بھائی نے مجھے ان کے گھر کا پتہ سمجھایا اور کہا کہ مجھے تو فرصت نہیں ملتی کہ تمہیں کالج لے کر جاؤں۔ تم جمال کے گھر جاؤ ان کی بہن کالج میں پروفیسر ہیں ان کی مدد سے داخلہ بہت آسان ہو جائے گا۔ میٹرک کے نمبر بھی بہت اچھے تھے۔ انہوں نے کہا تم اپنے داخلہ کے لئے خود کوشش کرو۔ مجھے اور کیا چاہئے تھا، میں شام کو راشدہ کو لے کر جمال صاحب کے گھر پہنچ گئی۔ ان کی بہن لطیفہ آپا اور مجیدہ آپا بہت خلوص سے پیش آئیں اور اگلے ہی دن کے وومن کالج سے فارم لیا اور خود ہی اسے پر کیا اور یوں داخلہ ہو گیا۔ اس زمانے میں طالب علموں کی بہت

مدد کی جاتی تھی شام کو بھائی کے آتے ہی میں نے ان کو ساری بات بتائی۔ بہت خوش ہوئے مجھے گلے لگا کر پیار کیا اور کہنے لگے میری یہ بہن بہت بہادر ہے۔اور بہت آگے تک پڑھے گی۔ میرا دل تو بڑھ کر ہاتھی کے برابر ہو گیا۔ بھائی کی حوصلہ افزائی تو مجھے بچپن سے ملتی رہی اور انہیں کے دیئے ہوئے حوصلہ سے میں آگے بڑھتی رہی اور ڈبل ایم اے کر پائی۔اس چھوٹے سے صاف ستھرے گھر میں بھائی اکثر اپنے دوستوں کی دعوت کرتے۔اماں کے ہاتھ کے پکے ہوئے خوش ذائقہ کھانوں سے لطف اٹھاتے۔فیض احمد فیض، حفیظ کاردار، ابن انشاء، سبط حسن اور بے شمار صحافی دوست آتے۔فرش پر خوبصورت چٹائیاں بچھا کر سفید دستر خوان بچھایا جاتا۔ہم بہنیں کھانا لگاتے ،اٹھاتے اور ساتھ ہی کھانا کھاتے۔ بھائی نے اپنے دوستوں سے کبھی پردہ نہیں کروایا۔ایک دن میں نے بھائی سے کہا کہ بھائی ایک کھانے کی میز اور چند کرسیاں خرید لیتے ہیں اتنے بڑے بڑے لوگ آتے ہیں کیا سوچتے ہوں گے۔ بھائی کو تھوڑا غصہ آیا کہنے لگے شاہدہ تمہارے دماغ میں یہ فضول قسم کا خیال کیسے آیا، جو لوگ یہاں آتے ہیں وہ مجھ سے میرے ابا اماں سے اور تم سب سے ملنے آتے ہیں اماں کے ہاتھ کے پکے ہوئے کھانے کھاتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں اور میں کسی کو زبردستی نہیں بلاتا۔ جن کو صوفوں پردوں اور میز کرسیوں والے گھروں میں جانا ہے تو وہاں جا سکتے ہیں۔ بہت سے گھر ایسے ہیں لیکن ان گھروں میں تم لوگوں کا خلوص پیار، اماں کے ہاتھ کے کھانے نہیں ملیں گے۔ میں اپنی سوچ پر شرمندہ ہوگئی اور بھائی کی سوچ پر فخر محسوس ہوا۔ بھائی اپنی وجیہہ خوبصورت شخصیت، علمی لیاقت ذہانت اور بات چیت کے انداز سے جلد صحافت کی دنیا میں نام پیدا کر رہے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد غالباً کسی اخبار نے ان کو لاہور بطور نامہ نگار بھیجا، تین مہینے رہ کر آئے۔ لاہور میں ان کے صحافی دوست بھی تھے اور پارٹی کے دوست بھی تھے۔آب وہوا بھی لاہور کی تھی سب چیزوں نے ان کی صحت پر اچھا اثر ڈالا۔اسی عرصہ میں بھائی کی شادی کی باتیں بھی گھر میں شروع ہوگئیں۔آپا جان نے یہ کام اپنے ذمہ لیا اور روزانہ چاند سی دلہن کی تلاش میں رہتیں۔تین ماہ کے بعد بھائی Leader کے نام سے نکلنے والے اخبار کے اسسٹنٹ ایڈیٹر بن گئے۔انہیں دنوں میں ابا کے کلیم کے کچھ کاغذات منظور ہو گئے اور ان کو جمشید روڈ پر ایک پرانی لیکن اچھی بنی ہوئی کوٹھی الاٹ ہوگئی۔اب کوٹھی کو صاف کروا کے ہم لوگ وہاں منتقل ہو گئے۔اب میں نے بھائی سے پھر کچھ فرنیچر کی فرمائش شروع کر دی۔انہوں نے کہا کہ بھئی تنخواہ کے پیسے میں اماں کو دے دیتا ہوں۔اس میں سے کچھ ہو سکتا ہے تو کرو۔فضل ربی تو میرے پاس ہے نہیں۔آہستہ آہستہ میں نے اور راشدہ نے مل جل کر اپنے سلیقہ اور کفایت سے

کچھ کرلیا تا کہ بھائی خوش ہو جائیں۔ مجھے آج بھی یاد ہے، میں اور راشدہ PIDC کین مارکیٹ جا کر چار بڑی بڑی آرام دہ کرسیاں اور میز خرید لائے اور گول برآمدے میں رکھ دیں۔ یہ 1954ء کی بات ہے یہ پہلا فرنیچر خریدا گیا تھا۔ آہستہ اہستہ گھر ٹھیک ہو گیا۔

اختر بھائی اور سرور بھائی دونوں اپنی اپنی دنیا میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ ملک کو صحیح راستے پر ڈالنے اور لوگوں میں شعور پیدا کرے گی جدوجہد میں لگے ہوئے تھے اور ساتھ ہی اپنی تعلیم اور صحافت کے میدان میں کامیابیوں کے جھنڈے گاڑ رہے تھے۔ یہاں تک پہنچ کر میں نے سوچا کہ اگر میں اسی طرح اپنی یادوں کو الفاظ میں ڈھالتی رہی تو نہ جانے کتنی موٹی کتاب بن جائے گی۔ اس لئے سوچا کہ اب اس کو سمیٹنا شروع کروں۔

دونوں بھائی اپنے سرکل میں بہت مقبول تھے۔ سرور بھائی Dow میں DSF کے نام سے ایک مضبوط تنظیم بنانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اور اس کے پہلے جنرل سیکریٹری بنے۔ ایک رسالہ بھی نکلنا شروع ہو گیا اس کے ایڈیٹر نسیم صاحب مقرر ہوئے۔ رسالہ (Students Herald) کے نام سے بہت مشہور ہوا۔ طالب علم اپنی مانگیں حکومت سے مانگ رہے تھے۔ کچھ سہولتیں مانگ رہے تھے۔ لیکن اس وقت کی طالب علموں کے جلسے، جلوسوں کے ذریعہ اپنی آواز حکومت تک پہنچانے میں کامیاب ہو رہے تھے اس وقت کے کراچی کے کمشنر اے ٹی نقوی صاحب تھے۔ جنہوں نے طالب علموں سے اور خصوصاً سرور بھائی سے ایک ضد باندھ لی تھی۔ جلسے، جلوسوں میں تیزی آ رہی تھی۔ ان پر گولیاں برسائی گئیں۔ کچھ طالب علم شہید ہوئے۔ 7 جنوری 1954ء کا دن طالب علموں کے لئے سیاہ دن تھا۔ سرور بھائی میڈیکل کے آخری سال میں تھے۔ حکومت وقت اتنی بوکھلائی کہ ان کو جیل بھیج دیا گیا۔ انہوں نے اپنا آخری امتحان جیل سے ہی دیا۔ کچھ ہی دنوں کے بعد اختر بھائی کو بھی اچانک پولیس نے گھر سے گرفتار کر کے کراچی سینٹرل جیل میں بھیج دیا۔ جرم یہ بتایا کہ تم سرور کے بھائی ہو اور اس کو Lead کرتے ہو۔ اختر بھائی ملک کے صحافیوں، طالب علموں، نوجوانوں اور کھلاڑیوں کے لئے بہت ہی پر عزم تھے، اور ان کے لئے بہت کچھ کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے بڑی محنت سے صحافیوں کی فیڈرل یونین آف جرنلسٹ کی بنیاد ڈالی اور اس کے پہلے جنرل سیکریٹری منتخب ہوئے۔ دونوں بھائی کراچی سینٹرل جیل میں دس ماہ رہے۔ ان دنوں بہت سے صحافی، طالب علم اور دانشور جیل کی سلاخوں کے پیچھے تھے۔ ہر ذی حسن انسان سوچ سکتا ہے

کہ یہ دس ماہ ہمارے خاندان پر کس طرح گزرے ہوں گے، بھائیوں کے کچھ دوست جو باہر رہ گئے تھے وہ ہم سب کے لئے بڑا سہارا تھے ان میں امروز اخبار کے نیوز ایڈیٹر ہارون سعد نے جس طرح ہمیں سہارا دیا، ہمیں بھائیوں سے ملنے کے لئے کمشنر ہاؤس سے اجازت نامہ دلوانے میں جس طرح بھاگ دوڑ کرتے وہ ہم سب جانتے تھے یا وہ خود بھائی جیل میں بیٹھ کر بھی ہمیں حوصلہ ہمت اور سہارا دیتے رہے۔ اچھی اچھی کتابیں منگواتے، پڑھتے اور ہمیں بھی پڑھنے کی تاکید کرتے۔ یوں یہ دس ماہ گزر گئے اور عدالت نے ان لوگوں کو رہا کیا اب بھی جب کبھی جیل چورنگی کے سامنے سے گزرنا ہو تو وہ سارا زمانہ آنکھوں میں گھوم جاتا ہے۔

کچھ دنوں پہلے کی بات ہے میں کسی ضروری کام سے زینب مارکیٹ سے ہوتی ہوئی صدر کی طرف جا رہی تھی۔ بائیں ہاتھ کی طرف کسی عمارت کے سامنے لوگوں کا ہجوم تھا۔ Playcard ہاتھوں میں لئے نعرے بازی کر رہے تھے۔ یوں تو یہ نظارہ کراچی کی ہر سڑک اور ہر گلی میں نظر آتا ہے۔ میں نے یونہی پوچھ لیا کہ کیا جگہ ہے ریاض (ڈرائیور) نے کہا۔ پیچھے پریس کلب کی بلڈنگ ہے۔ یہ لوگ پریس کلب کے سامنے کوئی مظاہرہ کر رہے ہیں پریس کلب! میرے ذہن میں ایک جھٹکا لگا۔ پریس کلب جس کے بانی میرے اختر بھائی تھے۔ جنہوں نے صحافیوں کو ایک پلیٹ فارم دیا۔ یونین بنائی۔ جو پاکستان میں صحافیوں کی پہلی یونین تھی۔ وہ صحافیوں کے لئے، طالب علموں کے لئے اور خواتین کے لئے بہت کچھ کرنا چاہتے تھے۔ خواتین کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنا چاہتے تھے۔ سادگی اور وقار کا پیکر دیکھنا چاہتے تھے اور اسی طرز پر ہم بہنوں کی تربیت کی بہت عرصہ تک ان کی ایک بڑی سی باوقار تصویر پریس کلب کے ہال کی زینت بنی رہی۔ اب معلوم نہیں وہ کہاں گئی ہوگی زمانہ گزر گیا معلوم نہیں ان کا سچائی، محنت سے کام کرنے کا اصول، صاف ستھری صحافت، سب کچھ کہیں کھو گیا۔

صدر میں رش بہت تھا، گاڑی آہستہ آہستہ چل رہی تھی، ایلفی کی فٹ پاتھ پر نظر پڑی۔ میری آنکھوں کے کیمرے نے ایک اور تصویر دکھائی رات کے دو ڈھائی بجے ہوئے۔ کراچی کی روشنیاں اور سڑک پر ٹریفک اس وقت بھی رواں دواں رہتی، فٹ پاتھ پر اختر بھائی، ہارون، ابن انشاء، حیدر صاحب قاضی ابرار اور جانے کون کون سے صحافی اپنے اپنے دفتروں سے رات کی شفٹ کا کام ختم کر کے نکل آتے۔ خوب گپ شپ لگاتے۔ فٹ پاتھ پر بیٹھ کر ایک دوسرے کی ٹانگ گھسیٹے مذاق کرتے دن بھر کی تھکن اتارتے۔ سگریٹ کے دھوئیں اڑاتے۔ یہ جواں مرد، محنت کش سچائی کے پیکر صحافی ملک کے مسائل کو سمجھنے اور سمجھانے میں مزید ایک

گھنٹہ گزار کر تازہ دم ہو کر اپنے اپنے گھروں کی راہ لیتے ۔ میرے دونوں بھائی اپنے مخلوص دوستوں کے ساتھ قوم کو بیدار کرنے، ان کو سہی راستہ دکھانے کے لئے پوری لگن اور سچائی کے ساتھ جدوجہد کر رہے تھے ۔ کئی لمحے کئی باتیں اور کئی حکایتیں ذہن میں آتی رہیں۔ اسی دوران بارش تیز ہوگئی اور اس تیز بارش نے میرے ذہن کو ایک اور جھٹکا دیا۔ اس جھٹکے نے 20 دسمبر 1958ء کی تصویر آنکھوں میں اتار دی۔ یہی کوئی دن کے گیارہ بجے تھے، دھواں دار بارش ہو رہی تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ آج آسمان پر جمے ہوئے سیاہ بادل اللہ میاں کے کنٹرول سے بھی باہر ہو رہے ہیں۔ جناح اسپتال کے برآمدے میں اسپتال کے بڑے بڑے مشہور ڈاکٹر، کراچی کے صحافی، کرکٹ کی دنیا کے ستارے۔ قریبی رشتہ دار اور ان سب کے بیچ میں میرے بڑے بہنوئی ڈاکٹر وحید، میرے چھوٹے بھائی ڈاکٹر سرور اور میرے ابا اور ان کے ساتھ میں جو تھوڑی دیر پہلے ہی لاہور سے پہنچی تھی۔ آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ سر جھکائے کھڑے ہیں۔ سب بے بسی کی تصویر بنے تھے۔ الہ آباد یونیورسٹی سے بین الاقوامی امور میں ماسٹر کیا ہوا مشہور Debator، خوبصورت بلند و بالا شخصیت کے مالک، صحافت کی دنیا میں تیزی سے آگے بڑھنے والے میرے بڑے بھائی اس دنیا کو چھوڑ کر عالم بالا کی طرف رخ کر رہے تھے۔ دراصل انہیں عالم بالا ہی میں رہنا تھا۔ دنیا ان کے لئے بہت چھوٹی تھی اور پھر انہیں کشور سے بھی تو ملنا تھا جو اس روایت میں جکڑی ہوئی دنیا میں ناممکن تھا۔ نفرتوں کی دیوار جو پاکستان اور ہندوستان کے درمیان حائل تھی ان دو محبت کرنے والے سچے اور پر خلوص انسانوں کو ملنے سے نہ روک سکی۔

اختر بھائی کی اس چھوٹی سی عمر کی کہانی کے انجام نے اماں اور ابا ان کو زندگی سے بہت دور کر دیا تھا۔ ہم سب بہنیں اور سرور بھائی اپنے اپنے سینوں میں اس اہندوناک غم کو سمیٹ کر دنیا کے کارخانے میں اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے ۔ یہی قانون قدرت ہے اور یہی دنیا کا دستور ہے۔